۲۰۱۲/۸/۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عقائد کی اصلاح کے تناظر میں تفسیر اور خاکے لاموجودہ الا اللہ کی تشریح (مختلف تفاسیر کی کتب سے)

قرآن مجید میں اس قسم کی بہت سی آیات موجود ہیں، جن سے صراحتاً یہ ثابت ہوتا ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا حقیقی معنی میں کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ چند آیات درج ذیل ہیں:

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْآخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝﴾ سورۃ الحدید: آیت ۳)

(وہی اول بھی ہے، اور آخر بھی، اور ظاہر بھی ہے، اور مخفی بھی، اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔)

(۱) یعنی وہی سب مخلوق سے اول سے ہے اور وہی سب کے فنا و ذاتی یا صفاتی کے بعد بھی رہے گا۔ یعنی اس پر نہ پہلے کبھی عدم طاری ہوا اور نہ آئندہ عدم کسی درجے میں بھی طاری ہوگا۔ اس لیے سب سے آخر میں وہی ہے اور وہی مطلق وجود کے اعتبار سے از روئے دلائل نہایت ظاہر ہے اور وہی کُنہ ذات (یعنی حقیقت) کے اعتبار سے نہایت مخفی ہے۔ یعنی اس کی ذات کا کوئی ادراک نہیں کرسکتا اور وہ گو خود تو ایسا ہے کہ مخلوق کو ایک حیثیت سے معلوم ہے اور ایک حیثیت سے غیر معلوم ،لیکن ساری مخلوق ہر اعتبار سے اس کو معلوم ہے اور وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔

(۲) یعنی جب کچھ نہ تھا وہ تھا، اور جب کچھ نہ رہے گا وہ رہے گا، وہ سب ظاہروں سے

بڑھ کر ظاہر ہے۔ کیونکہ دنیا میں جو کچھ ظہور ہے وہ سب اسی کی صفات اور اسی کے افعال اور اسی کے نور کا ظہور ہے، اور ہر مخفی سے بڑھ کر مخفی ہے، کیونکہ اس کی کُنہ (یعنی حقیقت ذات) کو کوئی نہیں پا سکتا۔

حدیث میں اس آیت کی بہترین تفسیر موجود ہے۔

حدیث: تو ہی پہلا ہے کوئی تجھ سے پہلا نہیں ہے اور تو ہی آخر ہے کوئی تیرے بعد نہیں، تو ہی ظاہر ہے کوئی تجھ سے اوپر نہیں، تو ہی باطن ہے کوئی تجھ سے مخفی نہیں۔ پھر اہل جنت اور اہل دوزخ کی ابدی زندگی کے کیا معنی؟ اس کا جواب آسان ہے، اللہ ان کو حیات ابدی عطا فرمائے گا۔ یہی معاملہ فرشتوں کے ساتھ ہوگا، کیونکہ بذات خود وہ غیر فانی نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا ان کا وجود رہے گا۔

(۳) کائنات، زبان حال سے اپنے خالق کی جن صفات کی خبر دے رہی ہے، قرآن میں ان ہی صفات کو الفاظ کی صورت دی گئی ہے کہ یہاں جب ایک چیز ظاہر ہوتی ہے تو وہ عمل کی زبان میں کہتی ہے کہ کوئی اس کا ظاہر کرنے والا ہے اور جب ختم ہو جاتی ہے تو وہ اس بات کا عملی اعلان کرتی ہے کہ کوئی اس کا ختم کرنے والا ہے۔ اسی طرح دیگر تمام اللہ تعالیٰ کی صفات کا معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات اگر خدا کی عملی تسبیح ہے، تو قرآن کریم خدا کی لفظی تسبیح ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ، اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ، اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ، يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ، نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ، يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ، وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ، وَاللّٰهُ بِكُلِّ

شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ.

(اللہ روشنی ہے آسمانوں کا اور زمین کا، مثال اس کی روشنی کی، جیسے ایک طاق، اس میں ہو ایک چراغ دھرا ہوا ایک شیشے میں، وہ شیشہ ہے جیسے ایک تارا چمکتا ہوا، تیل جلتا ہے اس میں ایک برکت کے درخت کا وہ زیتون ہے، نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف، قریب ہے اس کا تیل پھر روشن ہو جائے اگر چہ کہ نہ لگی ہو اس میں آگ، روشنی پر روشنی، اللہ راہ دکھاتا ہے اپنی روشنی کی جس کو چاہے، اور بیان کرتا ہے مثالیں لوگوں کے واسطے اور اللہ سب چیز کو جانتا ہے۔ (ترجمہ تحت اللفظ)

ترجمہ بامحاورہ

اللہ آسمان و زمین کا نور ہے، (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہے کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑک پڑتا ہو، چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے اسباب تمام جمع ہو گئے ہوں) اللہ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے، اور وہ لوگوں کو مثالوں سے بات کو سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔

خلاصہ

اس کے نور ہدایت کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے: فرض کرو کہ ایک محراب ہے اور اس میں ایک چراغ رکھا ہے اور وہ چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل طاق میں ہے اور وہ قندیل ایسا صاف اور شفاف ہے جیسا کہ ایک چمکدار ستارہ ہو اور وہ چراغ ایک نہایت مفید

درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے جو کہ زیتون کا درخت ہے اور وہ درخت ایسی جگہ ہے کہ نہ اس کے جانب شرقی میں کسی درخت یا پہاڑ کی آڑ ہے کہ شروع دن میں اس پر دھوپ پڑے اور نہ اس کی جانب غربی میں کوئی آڑ ہے پہاڑ کی کہ آخر دن میں اس پر دھوپ نہ پڑے، بلکہ وہ کھلے میدان میں ہے، جہاں دن تمام دھوپ رہتی ہے۔ ایسے درخت کا روغن بہت بہت لطیف اور صاف اور روشن ہوتا ہے اور اس کا تیل اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا اور جب آگ بھی لگ گئی تو نورٌ علیٰ نُور ہے۔ یعنی ایک تو اس میں قابلیت نور کی اعلی درجے کی ہے اور اوپر سے پھر آگ کے ساتھ اجتماع ہو گیا اور پھر اجتماع بھی ان کیفیات کے ساتھ کہ چراغ قندیل میں رکھا ہو جس سے بالمشاہدہ چمک بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ ایک ایسے طاق میں رکھا ہو جو ایک طرف سے بند ہو، ایسے موقع پر شعاعیں ایک جگہ سمٹ کر بہت تیز روشنی ہوگی، جیسے بہت سی روشنیاں جمع ہو گئی ہوں اس کو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٌ فرمایا۔ (یہاں پر مثال ختم ہوئی)

پس اس طرح مؤمن کے دل میں اللہ تعالیٰ جب نور ہدایت ڈالتا ہے تو روز بروز اس کا پھیلاؤ قبول حق کے لیے ہوتا چلا جاتا ہے، اور ہر وقت حکم الٰہی پر عمل کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، گو بالفعل بعض احکام کا علم بھی نہ ہو، کیونکہ علم تدریجاً حاصل ہوتا ہے۔ جیسے وہ زیتون کا تیل جو آگ لگنے سے پہلے ہی روشنی کے لیے تیار تھا، اسی طرح مؤمن بھی علم احکام پر عمل کرنے کے لیے اس کے علم سے پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے۔ پس جب اس کو علم حاصل ہوتا ہے تو عمل کی پختگی کے ساتھ نورِ علم بھی مل جاتا ہے۔ پس ایسے علم اور عمل کے جمع ہو جانے پر نورٌ علیٰ نور والی بات صادق آ جاتی ہے۔ غرض نور ہدایت الٰہیہ کی یہ مثال ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے اس نور ہدایت تک جس کو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے۔ اور اسی طرح قرآن مجید میں بہت سی مثالیں

بیان کی گئی ہیں اور ان سے بھی لوگوں کو ہدایت ہی مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

مذکورہ تمثیل میں چراغ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو اور طاق سے کائنات کو تشبیہ دی گئی ہے۔ اور فانوس سے مراد وہ پردہ ہے جس میں حضرت حق نے خود کو نگاہ خلق سے چھپا رکھا ہے۔ گویا یہ پردہ خِفا کا نہیں بلکہ شدّت ظہور کا پردہ ہے کہ نگاہ خلق اس کو دیکھنے سے عاجز ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ درمیان میں تاریکی حائل ہے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ درمیان کا پردہ شفاف ہے اور ایک شفاف پردے سے گزر کر آنے والا نور ایسا شدید، ایسا بسیط، اور ایسا محیط ہے کہ محدود طاقت رکھنے والی انسانی بینائی اس کا ادراک کرنے سے عاجز رہ گئی ہے۔ یہ کمزور انسانی بینائیاں صرف ان محدود روشنیوں کا ادراک کرسکتی ہیں جن کے اندر کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، جو کبھی زائل ہوتی ہے اور کبھی پیدا ہوتی ہے اور جن کے مقابل میں تاریکی موجود ہوتی ہے۔ لیکن نور مطلق جس کا کوئی مد مقابل نہیں، جو صدا ایک شان سے ہر طرف چھایا رہتا ہے اس کا ادراک ان کے بس سے باہر ہے۔

مثال میں تین چیزیں ہیں یعنی:

(۱) زیتون۔

(۲) اور اس کا غیر شرقی اور غربی ہونا۔

(۳) اور اس کے تیل کا آگ لگے بغیر ہی بھڑک پڑنا۔ یہ مستقل اجزائے تمثیل نہیں ہے، بلکہ پہلے جزءِ تمثیل یعنی چراغ کے ضمنی متعلقات ہیں اور اصل اجزائے تمثیل تو تین ہیں:

(۱) چراغ۔ (۲) طاق۔ (۳) اور فانوس شفاف۔

مَثَلُ نورِہٖ سے وہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے، جو ’’اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے‘‘ کے الفاظ سے کسی کو ہو سکتی ہے۔

اللہ کو نور کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے، کہ معاذ اللہ اس کی حقیقت ہی بس نور ہونا ہے، حقیقت میں وہ ایک ذات کامل ہے، جو صاحب علم، صاحب قدرت، اور صاحب حکمت وغیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب نور بھی ہے۔ لیکن خود اس کو نور محض اس کے کمال نورانیت کی وجہ سے کہا گیا ہے، اللہ کا نور مطلق سارے جہاں کو منور کر رہا ہے، مگر اس کا یہ ادراک ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی توفیق اور اس کے فیض سے مستفید ہونے کی نعمت اللہ ہی جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے، ورنہ جس طرح اندھے کے لیے دن اور رات برابر ہیں، اسی طرح بے بصیرت انسان کے لیے بجلی اور سورج اور چاند اور تاروں کی روشنی تو روشنی ہے، مگر اللہ کا نور اس کو سجھائی نہیں دیتا۔ اس پہلو سے اس بدنصیب اور بے توفیق کے لیے کائنات میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔

اقبال نے اسی خیال کو ظاہر کیا ہے:

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارہ غیر
نگاہ کی نہ مسلمانی سے فریاد

اقبال کا کہنا ہے کہ:

عقل انسانی محدود ہے، وہ بیک وقت ساری کائنات کا مجموعی علم حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دارومدار حواس پر ہے، اور حواس کا دائرۂ عمل محدود ہے،

اور اس کے مقابلے میں عشق الٰہی یا وجدان ایک ہی آن میں ساری کائنات کا علم حاصل کر سکتا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

تجلّی کی فراوانی، یعنی اسماء وصفات الٰہی کی تجلیات کی کثرت اس قدر ہے کہ انسان ان کو شمار نہیں کرسکتا۔ ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ یعنی حق تعالیٰ ہر لحظہ، ہر آن اپنی ذات اور اپنی صفات کی تجلیات نازل کرتا رہتا ہے۔

دوسرے شعر میں انسان کی عقل کے بارے میں اقبال کا کہنا ہے کہ وہ جہالت اور نادانی کی بنا پر کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا غیر کے وجود کو تسلیم کر لیتی ہے۔ یعنی عقل انسانی خود کائنات کو بھی حقیقی معنی میں موجود مانتی ہے اور یہ بات منافی توحید ہے۔ مسلمان وہ ہے جو حقیقی معنی میں اللہ کے سوا کسی کے وجود کو تسلیم نہ کرے۔ یہ کائنات تو موجود ہے لیکن اس کا وجود اصلی یا حقیقی نہیں ہے، بلکہ کائنات ظِل ہے اسماء صفات الٰہیہ کا۔

بس کلمہ طیبہ **"لا اله الا الله"** کا مطلب ہوا **"لا موجود الا الله"** یہی مسلک صوفیاء کا ہے اور یہی مسلک حق ہے۔

مذکورہ آیت سورۃ النور کے پانچویں رکوع کی پہلی آیت ہے۔ اور سورۃ النور کل ۹ رکوع پر مشتمل ہے۔ گویا اس کے عین وسط میں واقع ہے۔ اس رکوع میں ایمان اور اس کی اصلی حقیقت کو تفصیلات کے پیرائے میں سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں ایمان کی حقیقت اور اس کی ماہیت کے لیے تفصیل لائی گئی ہے کہ وہ ایک نور ہے، ایک روشنی ہے، جس سے انسان کا قلب، اس کا سینہ، اس کا پورا وجود، اور اس کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے۔

اب نور کے اجزاءِ ترکیبی دو ہیں:

(۱) ایک وہ نورِ فطرت جو ہر انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔

(۲) اور دوسرا نورِ وحی ہے جس سے نورِ فطرت کی تکمیل ہوتی ہے۔

آیت ''**اللہ نور السماوات والارض**'' ظاہری الفاظ سے قاری کو ایک مغالطہ لاحق ہوتا ہے کہ شاید یہاں نور کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو رہا ہے، اس غلطی سے بچنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اللہ کی ذات کا علم، ہمارے فہم و شعور، احساس و ادراک اور فکر و نظر، حتیٰ کہ تصور و تخیل کی سرحدوں سے بہت بہت دور ہے۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود

انسان جب یہ جان لیتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں کچھ جان نہیں سکتا، بس یہی کمال عرفان ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''اللہ کی ذات کے بارے میں بحث اور کھود و کرید سے انسان شرک اور فتنہ میں مبتلا ہو جائے گا'' اس لحاظ سے آیت مذکورہ میں تمثیل اللہ کی ذات کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس پر ایمان کی حقیقت بیان کرنے کے لیے ہے۔ گویا نور کا اطلاق ایمان باللہ پر ہے۔ امام رازی نے فرمایا کہ نور لامحالہ کوئی مادی چیز ہے، یا پھر کوئی عارضی کیفیت ہے اور ان دونوں کی نسبت اللہ کی طرف نہیں ہے۔ آیت میں دو مرتبہ ''نور'' ہی کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ مرکب اضافی کی ترکیب ہے کہ ایک چیز کی اضافت کسی دوسری چیز کی طرف کی گئی ہے۔

قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کی اضافت کسی طرف کی جاتی ہے تو وہ چیز اس کا غیر ہوتی ہے۔ جیسے ''میرا قلم'' اس میں ''قلم'' الگ ہے اور ''میں'' الگ ہوں، اور نسبت اضافی میرے اور قلم کے درمیان ہے۔ اس لحاظ سے ''نورِہٖ'' کے معنی اس کا نور یعنی اللہ کا نور، اس

سے ثابت ہوتا ہے کہ نور سے مراد اللہ کی ذات نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ذات باری پر نور کا اطلاق درست نہیں ہے۔ اس طرح ایک اور دلیل قطعی ''سورۂ انعام'' کی پہلی آیت میں موجود ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نور سے مراد ذات الٰہی نہیں ہوسکتی۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرَ﴾

(تمام شکر اور تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے پیدا کیے آسمان اور زمین اور بنائے اندھیرے اور روشنی) یہاں ثابت ہوگیا کہ نور مجعول ہے، یعنی بنائی ہوئی چیز ہے اور ظاہر بات ہے کہ اللہ کی ذات کو مجعول نہیں کہا جاسکتا۔

اب خود لفظ نور کو سمجھئے: نور یا روشنی اصل میں وہ چیز ہے جس کی وجہ سے چیزیں ظاہر ہوتی ہیں کہ روشنی ہی کے ذریعے ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اگر روشنی نہ ہوتو اندھیرے میں باوجود ہماری بصارت کے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ مختصر یہ کہ ہماری ظاہری بصارت کے لیے ایک مادی اور خارجی نور کی ضرورت ہے ورنہ دیکھ نہیں سکتے۔ اسی طرح ایک باطنی نور ہوتا ہے جس سے چیز کے علاوہ چیز کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے دعا فرمایا: ''اے اللہ مجھے چیزوں کی حقیقت دکھا جیسی کے وہ ہیں۔'' (اَللّٰهُمَّ أَرِنِىْ حَقِيْقَةَ الأَشْيَاءَ كَمَا هِىَ)

بقول اقبال کے:

اے اہل نظر، ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

اس طرح بصیرت باطنی کے لیے ایک نور باطنی کی ضرورت ہے اور وہ نور باطنی

معرفت خداوندی ہے۔اسی نور معرفت خداوندی کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۲۵۷ میں ہے: ﴿اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ﴾ (یعنی اہل ایمان کا اللہ دوست ہے،ان کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالتا ہے،یعنی لاتا ہے۔)

جو اللہ کو پہچان لیتا ہے تو اس کائنات کے جملہ حقائق کونیہ (Facts of universe) اور حقائق تکوینی (formative Facts) کے ساتھ حقائق تشریعی (Legistative facts) بھی اپنے جملہ اسرار اور حِکَم کے ساتھ منور ہو جاتے ہیں۔اور ہر چیز کی حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔اس طرح جملہ حقائق منکشف ہو جائیں گے کہ آغاز کیا ہے؟ اختتام کیا ہے؟ وجود کی ماہیت کیا ہے؟ موت کی حقیقت کیا ہے؟ خیر وشر کی حقیقت کیا ہے؟ علم کس کو کہتے ہیں؟ موت اور مکافات کیوں ضروری ہیں؟ یہ سب انسان کو معلوم ہو جائے گا، بشرطیکہ وہ اللہ کو جان لے۔

جس طرح ہماری ظاہری بصیرت کے لیے خارجی نور ضروری ہے۔اسی طرح بصیرت باطنی کے لیے نور معنوی ضروری ہے۔جس کو معرفت خداوندی یا ایمان باللہ کہتے ہیں۔

نُورِهٖ کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد نور ہدایت ہے۔

(۲) اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد رسول خدا ہیں۔

ان سب کو جمع کر لیں تو تینوں مل کر ایک وحدت بن جاتی ہے۔

ایک اور رائے بھی ہے کہ مثال اُس کے نور کی جو ایمان لاتا ہے۔اُس نور کی مثال

بیان ہورہی ہے یعنی قلب مومن میں جونور ایمان پیدا ہوتا ہے اس کی تمثیل بیان کی گئی ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (سورۃ القصص:۸۸)

(سوائے خدا کی ذات کے ہر چیز فنا ہونے والی ہے)

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (سورہ الحدید:۲۰)

(اور دنیاوی زندگی متاع فریب کے سوا کچھ نہیں)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس بات کو انسان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دنیا کی زندگی دراصل ایک عارضی زندگی ہے۔ یہاں کی بہار عارضی اور خزاں عارضی، دل بہلانے کا سامان بہت کچھ ہے۔ مگر درحقیقت وہ نہایت حقیر اور چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں، جن کو انسان اپنی کم ظرفی کی وجہ سے بڑی چیز سمجھتا ہے اور اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ انہی کو پالینا گویا کامیابی کی انتہا کو پہنچ جانا ہے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ تقدیر کی ایک ہی گردش خود اس دنیا میں ان پر جھاڑو پھیر دیتی ہے۔ اس کے برعکس آخرت کی زندگی ایک عظیم اور ابدی زندگی ہے۔ وہاں کے فائدے بھی عظیم اور مستقل ہیں اور وہاں کا نقصان بھی عظیم اور مستقل ہے۔ کسی نے اگر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور خوشنودی وہاں پالی، تو اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نعمت اور سعادت نصیب ہوگئی۔ جس کے سامنے دنیا بھر کی دولت بیکار ہے اور اس کے برعکس جو وہاں کے عذاب میں گرفتار ہوگیا اس نے اگر اس دنیا میں سب کچھ پا لیا تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ بڑے گھاٹے کا سودا کر کے آیا ہے۔

عشق الٰہی اور دنیاوی عقل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اقبال نے ایک رباعی میں ان خیالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک کا نام روحانیت ہے اور دوسرے کا نام مادیت ہے۔ اول الذکر عشق الٰہی کی بدولت ظہور میں آتا ہے اور آخر الذکر، زاویہ نگاہ یا مسلک زندگی،

عقل سے پیدا ہوتا ہے۔

خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے
جہاں روشن ہے نور لا الہ سے
فقط ایک گردش شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغ مہر و ماہ سے

کیونکہ عشق اور عقل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مادہ پرست اور خدا پرست یعنی دنیا رخی زندگی گزارنے والا اور آخرت رخی زندگی گزارنے والا، ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ مادہ پرست عقل کے علاوہ اور کسی طاقت یا ذریعہ حصول کو تسلیم نہیں کرتا اور خدا، عقل اور حواس کی سرحدوں سے آگے ہے۔ اس لیے مادہ پرست اس کو پا نہیں سکتا۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا کا وجود عقل سے ثابت کرو۔ عقل انسانی کا حال یہ ہے کہ وہ دلائل وغیرہ سے اس مقام تک تو ضرور پہنچ جاتی ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور کوئی صانع ہونا چاہیے۔ اس طرح ''عقلی شواہد'' ہستی باری تعالیٰ کا ظن غالب تو پیدا کر دیتی ہے، لیکن یقین پیدا نہیں کر سکتی۔ مادہ پرست یہ کہتا ہے کہ جو چیز عقل سے پوری طرح ثابت نہ ہو، یا سمجھ میں نہ آئے اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ عقلی دلیل لاؤ بلکہ ہو سکے تو مشاہدہ کراؤ تو ایمان لاؤں گا۔

اس کے برعکس خدا پرست کہتا ہے کہ خدا کا وجود عقل سے نہیں بلکہ وجدان سے ثابت ہو سکتا ہے۔ مادہ پرست کہتا ہے کہ میں تمہارے وجدان (یعنی عشق) کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ دونوں کی رائے میں حقیقت رَسی کے ذرائع مختلف ہیں۔ اقبال نے مذکورہ رباعی میں ان دونوں زاویہ نگار کا ذکر کر دیا۔ روحانیت کی تعلیم یہ ہے کہ: یہ کائنات تمام ''از اول تا آخر'' کسی زبردست ذہن یا روح کا ظہور ہے، یا پھر اس کی خارجی شکل ہے۔ اور

مادیت کی تعلیم یہ ہے کہ یہ کائنات تمام کی تمام ''از اول تا آخر'' مادے کی حرکات اور اشکال مختلفہ کا ظہور ہے اور کائنات کی تمام چیزیں مادی ذرات کے امتزاج (ترکیب) کا نتیجہ ہے۔ یعنی کائنات کی حقیقت مادی ہے، اسی کو طبعی یعنی (Natural) بھی کہتے ہیں۔

خلاصہ رباعی:

اقبال کا کہنا ہے کہ اگر انسان اس کائنات کا مشاہدہ دل کی نگاہ سے کرے تو یہ حقیقت اس پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ یعنی بذات خود وہ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ بلکہ **لا الہ** کے نور یعنی اسماء صفات الٰہیہ کی بدولت قائم ہے۔ یعنی ان کا عکس ہے یا پھر ان کا ظل (سایہ) ہے۔ اس جہاں کی ہر چیز میں اللہ ہی کا ظہور ہے۔ گویا لفظ ''روشنی'' سے ''وحدت الوجود'' کا مفہوم نکل سکتا ہے اور اگر اس کے برعکس کائنات کا مشاہدہ عقل کی نگاہ سے کریں تو صفات الٰہیہ کا عکس تو نظر نہیں آتی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوانین فطرت کی پابند ہے۔ یعنی محوری گردش، مداری گردش، کشش ثقل وغیرہ۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلک عشق یا مذہب کی رو سے کائنات میں اللہ کے سوا کسی کا وجود مستقلاً نہیں ہے اور عقل کی رو سے کائنات میں مادے کے سوا اور کچھ موجود نہیں ہیں۔

عقل اور سائنس:

جب عقل نے سائنس کی مدد سے ترقی کی تو دنیا ایجادات سے بھر گئی۔ لیکن عقل اور سائنس دونوں نے مل کر بنی آدم سے ہمدردی کا جذبہ چھین کر انتخابات اور مسابقات کا جذبہ دے دیا۔ ''انجیل'' میں آتا ہے کہ ''خداوندی کا خوف عقلمندی کی ابتدا ہے۔'' لیکن عقل اور سائنس اس خوف خدا کے لیے ذریعہ نہ بن سکے۔ عقل اور سائنس، انسانی مشکلات اور دشواریوں کا حل تلاش کرنے کے لیے نکلے تھے لیکن اس کے برعکس ہزاروں دشواریاں پیدا کر

دیے اور یہ سلسلہ غیر مختتم ہے۔

عقل کو مَنطقی اصطلاح میں قوت مُدرِکَہ (دریافت کرنے کی قوت) کہتے ہیں۔ عقل خود بین بھی ہے اور جز بین بھی ہے، نتیجتاً محدود بھی ہے۔ عقل کی یہ کیفیت جب عشق سے متأثر ہو جاتی ہے تو عقل خود بین سے جہاں بین ہو جاتی ہے اور جُز کے آگے کُل کو دیکھ سکتی ہے۔ اس طرح مومن کے لیے عشق الٰہی جہاں بین ہے اور حقیقت اشیاء سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ وہ انسان قابل مبارک باد ہے جس کو عقل جہاں بین حاصل ہو جاتی ہے۔ عشق ہی کی بدولت خود آگہی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ مؤمن عشق کی بدولت مقصد حیات کے حصول کی وجہ سے حقیقی زندگی حاصل کر لیتا ہے، تو اطمینان قلب کے ساتھ اس کائنات کا مطالعہ کر لیتا ہے اور کائنات کو مسخر کر لیتا ہے۔

انسان کی اصل عشق الٰہی ہے نہ کہ مادہ:

غور کریں تو پتہ چلے گا کہ انسان کی اصل عشق الٰہی ہے۔ لیکن انسان نے اس دنیا میں آ کر اپنی اصل کو فراموش کر دیا، اور مادیات میں گرفتار ہو گیا اور ہوس اور خواہشات نفس کو اپنا شعار زندگی یعنی طریقۂ زندگی بنا لیا۔ نفس امارہ کی غلامی اختیار کر لی۔ چنانچہ اس غلط بینی اور غلط کاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے تمام قوانین شریعت کو بالائے طاق رکھ دیا، اور انسان کا وجود بنی آدم کے حق میں بلائے بے علاج ہو گیا۔ اس نے امن و امان کے بجائے جنگ و جدل کو مقصد حیات بنا لیا اور اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرنے لگا۔ اس سے رہزنی کو رہنمائی اور جہاں سوزی کو جہاں بانی اور نافرمانی کو اطاعت قرار دیا اور دنیا میں قانون الٰہی نافذ کرنے کے بجائے قانون انسانی، یعنی خود کا وضع کردہ قانون نافذ کر دیا۔ آج دنیا میں جملہ ۵۷ اسلامی ممالک ہیں، لیکن اسلامی حکومت کہیں بھی نہیں ہے۔

ہم نے خودشاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہُوا ہے خود شناس و خودنگر

یوں بھی دیگر اسلامی ممالک میں جو طرزِ حکومت ہے اور جس کو وہ اسلامی کہتے ہیں اس میں اور ملوکیت میں صرف نام کا فرق ہے۔اس طرح خدا کے بندوں کو خدا کا بندہ بنانے کے بجائے اپنا بندہ اور اپنا غلام بنانے لگ گئے ہیں۔دنیا میں تمام فتنہ وفساد،قتل وغارت گری، بدامنی اور بے چینی کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انسان خدا کا نائب بننے کے بجائے خود خدا بن گیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ ملوکیت کے شر سے اللہ کے بندے تباہ ہو گئے ،اس طرح ملوکیت اس دنیا میں ساری خرابیوں کا منبع ہوگئی کہ اس کی وجہ سے نوع انسانی کا شکاری خود انسان ہو گیا۔

شرک کی تفصیلات اور اس کی قباحتیں

انبیاء علیہم السلام سارے کے سارے شرک کو روکنے کے لیے آئے اور اللہ واحد کی دعوت دینے کے لیے آئے۔ایک لاکھ ۲۴ ہزار کم وبیش انبیاء کرام وقتاً فوقتاً اس دنیا میں مختلف مقامات پر آتے رہے،اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ دنیا میں انسان شرک کی طرف مائل ہوتا رہا، یہ اس کی طبیعت کا میلان ہے اور شرک اللہ کی نظر میں گناہ کبیرہ ہے اور شرک سے ساری نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔

مشرک نجس ہوتا ہے، ناپاک ہوتا ہے، اہل ایمان مشرک کی صحبت سے دور رہتا ہے۔اگر کوئی شرک کی حالت میں مر گیا اور توبہ نہ کر سکا تو یوم قیامت اس کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا،مشرک کے لیے دعائے مغفرت نہ کرنے کا حکم ہے، یہاں تک کہ رسول خدا بھی مشرک کے لیے دعائے مغفرت نہ کریں۔

رسالت مُحمّدِ یہ سے امّت مُحمّدِ یہ کو تین نعمتیں حاصل ہوئیں

(۱) آزادی

(۲) آپسی بھائی چارگی

(۳) آپسی مساوات
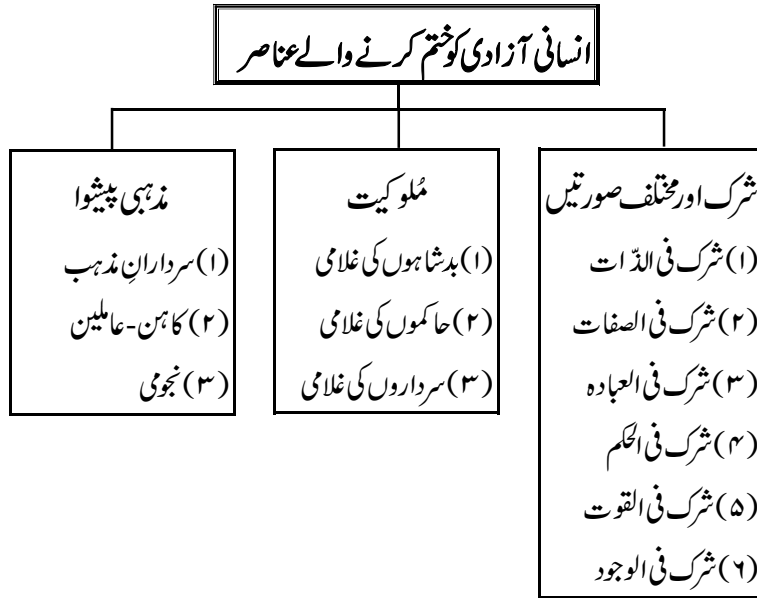
تخلیق انسانی کا مقصد یہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے۔لیکن اگر وہ کسی اور اعتبار سے بھی دوسروں کا غلام ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرسکتا۔اس لیے آزادی ضروری ہے اور اسلام،فرد کے علاوہ جماعت کی تربیت کا بھی ضامن ہے اور ہیئت اجتماعیہ کی نشونما اور ترقی،اُخوّت اور مساوات کے بغیر ناممکن ہے۔

قرآن مجید کے علاوہ دنیا میں جس قدر مذہبی کتابیں موجود ہیں،ان میں سے کسی کتاب میں آزادی کی تعلیم نہیں ملتی۔بعض کتابوں میں اُخوّت یا مساوات کی تعلیم ضرور موجود

ہے، لیکن وہ بھی ناقص اور مبہم ہیں۔ قرآن مجید کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیا کو پہلی مرتبہ حقیقی آزادی (حریت) قوت یا مساوات کی تعلیم سے آشنا کیا اور اس کے قوانین بھی نافذ فرمائے، جن کی بدولت یہ اصول سہ گانہ زندہ رہ سکتے ہیں اور یہی وہ خصوصیت ہے، جو قرآنی تعلیمات کو تمام مذاہب عالم کی تعلیمات پر فوقیت عطا کرتی ہے۔

قرآن حکیم نے ان تمام مقاصد کو بند کروادیا جو انسان کو آزادی سے محروم کر دیتے ہیں۔

(۱) شرک انسان کو آزادی سے محروم کر دیتا ہے۔

(۲) ملوکیت اور اس کی مختلف صورتیں انسان کو آزادی سے محروم کر دیتی ہیں۔

چنانچہ سلاطین بنی آدم کو اپنا مطیع بنانا چاہتے ہیں، اس کے بعد کوئی بھی شخص دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا، اس لیے قرآن نے ملوکیت کی تمام صورتوں کو باطل قرار دے دیا ہے (لَا مُلُوْكِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)

جادوئے محمود کی تأثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقہ گردن میں ساز دلبری

(۳) مذہبی پیشوا، تارکین دنیا، دولت مند حضرات بھی انسانوں کو حُرّیت سے محروم کر دیتے ہیں، اس لیے اسلام نے ان تمام لوگوں کی مذمّت کی ہے، چنانچہ اس نے بزرگی اور فضیلت کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ ہو، یعنی مسلمانوں میں سب سے زیادہ باعزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ مذاہب عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ مذکورہ گروہوں نے مختلف طریقوں سے انسانوں کو خدا کی اطاعت کے بجائے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری پر مجبور کیا۔ یہ لوگ ہر زمانے میں انسانوں کے دماغوں پر حکمران

رہے ہیں۔اسلام چونکہ انسان کوصرف اللہ کا غلام بنانا چاہتا ہےاس لیےاس نے بنی آدم کوان تمام طبقات کی غلامی سے نجات دلایا۔یورپ نے جس آزادی کی نعمت سے انسانوں کو اٹھارویں صدی عیسوی میں آشنا کیا،اسلام نے وہ نعمت ساتویں صدی (نبوت اگست ۶۱۰ء) ہجری عیسوی میں عام کر دی تھی۔ یورپ نے انسانوں کوصرف سیاسی آزادی سے آشنا کیا، لیکن اسلام نے انسان کوآزادی کی جملہ اصناف سے مالا مال کر دیا۔مثلاً

(۱) حُرّیَت نفس: یعنی ہر انسان اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوتا ہے۔

(۲) حُرّیَت ضمیر: یعنی دین کے معاملے میں ہر شخص آزاد ہے،کوئی کسی پر جبر نہیں کرسکتا یعنی لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ.

(۳) حُرّیَت علم: یعنی ہر شخص حصول علم میں آزاد ہے،کوئی شخص کسی پر پابندی عائد نہیں کرسکتا،جیسا کہ ہندو دھرم میں شودھر،وید کا علم حاصل نہیں کرسکتا۔

(۴) حُرّیَت عقل: یعنی ہر شخص کوغور وفکر اور اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی حاصل ہے۔

(۵) حُرّیَت عمل: یعنی ہر شخص کوعمل اور ترقی کی آزادی اور مواقع حاصل ہیں۔

(۶) حُرّیَت وطن: یعنی ہر شخص جس خطہ زمین کو چاہے اپنا وطن بنا سکتا ہے۔

ان مذکورہ توضیحات اور تشریحات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام دنیا میں انسان کی آزادی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔اسلام نے انسان کوان آزادیوں کی نعمت سےاس لیے مالا مال کیا ہے تا کہ وہ دل جمعی اور سکون کے ساتھ اللہ کی کامل اطاعت کر سکے۔

اگر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ توحید الٰہی'' لا الہ الا اللہ ''کا مطلب ہی یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی انسان پر حکمران نہیں ہیں۔اس لحاظ سے توحید ہی سے

حُرّیَت پیدا ہوتی ہے اور حُرّیَت سے مساوات نسل انسانی ہے۔ کیونکہ سارے انسان ایک خدا کے بندے ہیں، یعنی اللہ کے غلام ہیں تو پھر ایک انسان دوسرے انسان کا غلام نہیں ہو سکتا، بلکہ سارے انسان اللہ کے غلام ہو جائیں گے اور سارے انسان آپس میں ہم رتبہ ہیں، البتہ آپسی اخوّت یعنی بھائی چارگی کے لیے ایمان کی قید لگائی گئی ہے۔ کیونکہ آدمی جب تک ایمان نہ لائے اس کی آزادی مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں آپسی مساوات اور اخوت بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کافر اور مشرک مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتا مکمل آزادی توحید ہی میں ہے، یعنی آزادی اسلام قبول کرنے کا انعام ہے۔

دل کی آزادی، شہنشاہی، شکم، سامان موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

جہاں میں بندۂ حق کے مشاہدات ہیں کیا
تیری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے؟

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرائیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنون بھی ہے صاحب ادراک

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط ایک مسئلہ علم کلام

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد

توحید سے حریت پیدا ہوتی ہے۔تعمیر خودی کے لیے توحید ضروری ہے۔ جو کل تک غلام تھے وہ آزادی پانے کے بعد حکمران ہو گئے۔

اسلام کا خدا ساری کائنات کا خدا ہے، اور اسلام کا رسول ساری کائنات کا رسول ہے، اور مسلمانوں کی قومیت کی اساس کلمۂ توحید ہے۔

حضرت عیسی علیہ السلام کا قول ہے کہ ایک غلام دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔

حدیث: جو مسلمانوں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

دور حاضر، اسلامی ممالک اور مسلمان:

۲۱ رویں صدی اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں دنیا کے طول و عرض میں انقلابات آئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں برسوں سے اقتدار سے چمٹے ہوئے حکمرانوں کو بے دخل کرنے کے لیے عوام متحد ہو گئے اور ہمیں بحیثیت مسلمان بھی عالم اسلام کے حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے، تا کہ عالم کے مسلمانوں سے باخبر رہ سکیں۔ عرب ممالک کے انقلابات سے واقفیت حقیقی طور پر رکھنا ضروری ہے تا کہ ناظرین کا اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھ کر اسلامی ذہن بن سکے۔

غلامی در غلامی:

اسلام کے نظام میں اعتقادات، عبادات، اسلام کے ارکان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تہذیب و تمدن، معاشیات، سیاسیات یہ تمام چیزیں دائرہ اسلام اور دائرہ دین میں داخل ہیں۔ آزادی، انسانی مساوات اور انسان کے بنیادی حقوق، اسلام میں بہت اہمیت

رکھتے ہیں۔ دنیا میں جتنے بھی اسلامی ممالک ہیں وہاں کہیں بھی اسلامی حکومت نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی حکومت ہے۔ جہاں کے عوام آزادی کی نعمت سے محروم ہیں، اب عوام بیدار ہو چکے ہیں۔ حکمرانوں کی گردن ناپ رہے ہیں چنانچہ تیونس، لیبیا، اور مصر میں جبری حکومتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ انقلاب کی لہر اردن، الجزائر، مراکش اور شام ہر طرف پھیل رہی ہے۔

تاج اُچھالے جا رہے ہیں، تخت گرائے جا رہے ہیں، احتجاجات، مطالبات اور مظاہروں سے حکومتیں لرزاں ہیں، کیونکہ یہ حکمران ایک عرصہ دراز سے مغربی ممالک امریکہ، فرانس اور برطانیہ کے زرخرید غلام ہیں۔ یہ لوگ عوام کو اپنا غلام بنائے ان کی آزادی کو ختم کر دیے۔ اس طرح مسلمان حکمران انگریزوں کے غلام اور یہ رعایا حکمرانوں کے غلام۔

کیسے مسلمان، کیسا اسلام، اور کیسی حکومتیں؟

''مسلمان، ابلیسی نظام کو ختم کرنے کے لیے اپنی زندگی لگا کر قیمتی ہو جائیں۔''

(اقبال)۔

ایسی غلامی در غلامی سے آزادی کی جدو جہد عوام کر رہی ہے۔ تو علمائے عرب فتوے جاری کر رہے ہیں کہ حکومت کے خلاف بغاوت حرام ہے اور پُر امن مظاہرے اور جلوس سب ناجائز ہیں۔ ایک طرف آزادی کو حاصل کرنے کے لیے عوام جان کی بازی لگا رہے ہیں اور ادھر علمائے وقت کے یہ فتوے۔ ایسی صورت حال میں عوام تو عوام خواص بھی اس خصوص میں کشش و پنج میں ہیں کہ دراصل اسلام کی رائے کیا ہے؟ دین کس اعتبار سے رہنمائی کرتا ہے؟ اور اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے؟ اس کا جواب آسان ہے، علماء حق بجانب نہیں ہیں، کیونکہ وہ خود غلام ہیں۔

ایسے گئے گزرے زمانے میں بھی علمائے حق کہیں نہ کہیں خال خال ہی صحیح موجود ہیں۔ جو اسلام کا صحیح نظریہ کو حالات حاضرہ کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ یوسف القرضاوی نے عوام کے مطالبات کی پرزور تائید کی ہے اور حکومتی استبداد اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی حمایت کی ہے اور غلام حکمرانوں کی تائید کرنے کے بجائے، عوامی تحریک کی تائید کی ہے۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ علماء عرب اور مفتیان عرب عمامہ بدوش وعقال پوش اپنے عرب ممالک میں اس قدر آزاد نہیں ہیں، جتنے ہندوستان وغیرہ میں علمائے کرام اور مفتیان کرام آزاد ہیں۔ جامع ازہر کے علماء، حسنی مبارک'' کی ۴۰ رسالہ حکومت تک انہی کی تائید میں فتوے دیتے رہے، یعنی حق کے خلاف انہی کی تائید کرتے رہے۔

اگر اسلام مکمل نظام حیات ہے اور سیاست اور حکومتی امور بھی اسلام میں داخل ہیں، تو علماء کرام ان استبدادی (۱) حکومتوں اور (۲) حاکموں کے خلاف خاموشی کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں؟ ان کی خاموشی کا مطلب یہ ہوا کہ سیاست سے دین کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اور دین ایسے حالات میں کوئی رہنمائی نہیں کرتا ہے۔ اس خاموشی کا مطلب صرف یہی ہے کہ حکمرانوں کے ظلم وستم کی خاموش حمایت کی جائے اور اس خاموشی میں خود کی سلامتی بھی قائم رہ سکے۔

اسلام اس خصوص میں کیا رہنمائی کرتا ہے؟

(۱) اگر خلیفہ کسی جماعت پر ظلم کرے تو اس ظلم سے نجات کے لیے مظلوم جماعت اطاعت امیر سے انحراف کرے اور اپنا حق طلب کرے۔ ایسی صورت میں اس جماعت کو ''باغی'' اور اس عمل کو ''بغاوت'' کا نام نہیں دیا جاسکتا اور دیگر مسلمانوں کے لیے یہ زور نہیں ہے کہ وہ خلیفہ کی مدد ان مظلوموں کے خلاف کرے، اس طرح ظلم پر مدد ہوگی۔

(۲) اسلام نے اطاعت امیر کا حکم دیا ہے، نہ کہ اطاعت آمر کا۔ اور امیر وہ ہے جو مسلمانوں کی رضا اور پسند سے منتخب ہو جس کو خلیفہ کہتے ہیں۔ اور آمر وہ ہے جو از خود مسلط ہو جائے اور ملک کے نظام کو اسلامی اقتدار حیات پر چلانے کے بجائے مغرب کے نظام حیات پر چلاتا رہے۔۔۔ ایسے حالات میں عوام اگر اسلامی جمہوری نظام کی خاطر موجودہ دیرینہ استبدادی نظام کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں تو قابل مبارکباد ہوئے۔

یہ بات یقین کی حد تک پہنچ چکی ہے کہ دین کا صحیح تصور خصوصاً اسلامی نظام میں حکومت کے سلسلے میں نہ صرف عوام بلکہ خواص کے ذہنوں سے بھی محو ہو چکا ہے کہ وہ ''اسلامی حکومت'' اور ''مسلمانوں کی حکومت'' کے درمیان فرق نہیں کر سکتے۔ ''اسلامی اقتدار'' اور ''مسلمانوں کے اقتدار'' کے درمیان فرق نہیں کر سکتے۔

یہ لوگوں کی دین بیزاری اور دیندار بیزاری کی حد ہو گئی کہ وہ خود مستی کی زندگی میں مشغول ہیں۔ لوگوں کا یہ تصور ہے کہ اگر مسلمان بادشاہ ہو یا مسلمان صدر ہو تو اس قدر کافی ہے۔ حالانکہ انفرادی زندگی میں جس طرح نماز، روزہ، وغیرہ کی پابندی ضروری ہے اسی طرح اجتماعی زندگی میں اسلام کے سیاسی اور اقتصادی احکام کا نفاذ بھی ضروری ہے اور اگر یہ نظام نافذ نہیں ہے، تو وہ اسلامی حکومت ہی نہیں ہے اور اگر ایسی حکومت کو بدلنے کی کوشش ہو رہی ہے تو ایسی کوشش پر اسلامی خلافت کے سلسلے کے فتاوے صادر کرنا ایک بے جوڑ بات ہے۔ یہ صرف زمانہ سازی ہے خود فریبی ہے اور عوام کو دھوکہ دینا ہے۔ کیونکہ یہ فتوے تصور دین کے عین خلاف ہیں۔

علماء کرام اور مفتیان عظام کا فرض منصبی ہے کہ وہ مسلمانوں کی صحیح رہبری علمی روشنی میں کریں تا کہ مسلمان واقف ہو جائیں۔

(۱) اسلامی نظام حکمرانی کیا ہے؟

(۲) شریعت کے نفاذ کی کیا صورتیں ہیں اور کس قسم کی کوشش کرنی چاہیے؟

(۳) اسلام کا شورائی اور جمہوری نظام کیا ہے؟

(۴) اسلام میں موروثی اور بادشاہی نظام کو کس قدر ناپسند کیا گیا ہے؟

(۵) اسلام کے سیاسی نظام کے قدوقال کیا ہیں؟

دین تو نصیحت کا دوسرا نام ہے، علماء کے پاس زبان ہوشمند اور دل دردمند ہو، اور دوسری طرف اہل سلطنت کے پاس گوش حقیقت پسند ہوں۔ حق گوئی اور نصیحت تو علماء کا فرض منصبی ہے نہ کہ خوشامدی، زمانہ سازی اور بے وقت کا سکوت اختیار کرنا۔

حکمرانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خارجی پالیسی پر نظر ثانی کریں۔ کیونکہ اپنی گدی کو بچانے کے لیے عوام کا خون کرنا اور مغربی حکومتوں کے اشارے پر چلنا، جس پر چلنے سے اسلامی مفاد سراسر خطرے میں ہے ایک زبردست غلطی ہے۔

عرب ممالک میں ۶ رکروڑ عوام ناخواندہ ہیں، باہر کا سامان درآمد کرنا، عیش کرنا اور خوشحال اور خوش جمالی یہی معیار زندگی عربوں کی نظروں میں ہے۔

عرب ممالک کے انقلاب کو اسپرنگ ریولیوشن کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن اصل بہار تو بہت دور ہے۔ کیونکہ اسلام کا عادلانہ نظام مکمل طور پر روئے زمین پر کہیں بھی نہیں ہے۔ اسلامی نظامِ حکمرانی میں خلیفہ کی اطاعت انہی احکام میں ہوتی ہے جو شریعت کے مطابق ہوں اور خلیفۃ الوقت معزول کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جب وہ شریعت کا نفاذ نہ کرے، یا شریعت سے استخفاف کرے، یعنی شریعت کو اہمیت نہ دے۔ اگر خلیفہ کا انداز حکمرانی موافق شریعت نہ ہو تو اس پر تنقید بھی افضل الجہاد ہے۔

رُشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد
(ظلم۔ ناطاقتی کی سزا کا نام ہے۔)
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی یا خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانہ

(اقبال)

وَ إِذْ قُلْنَا لِلْمَلآئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيْسَ أَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (سورۃ البقرہ:۳۴)

(اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان، اس نے نہ مانا اور تھا وہ کافروں سے۔)

فَسَجَدَ الْمَلآئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُوْنَ. إِلَّا إِبْلِيْسَ اسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (سورۃ ص:۷۴-۷۳)

(پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا مگر شیطان اکڑ بیٹھا اور وہ کافروں میں ہو گیا۔)

تشریح: اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم کو سجدہ کریں تو سوائے ابلیس کے سب سجدے میں گر پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے فرمایا کہ تو نے تکبر کی وجہ سے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور تو کافروں میں سے ہو گیا۔ اس پر ابلیس نے جواب دیا کہ اے کائنات کے مالک! مجھے آدم سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور میں کس طرح تیرے حضور میں بڑائی اور تکبر کا کلمہ زبان پر لاتا، یا سجدہ کرنے کے حکم سے انکار کرتا، میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں آدم کے لیے سجدہ کرنا تیری مرضی اور تیرے ارادے میں ہی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تجھ کو کب

معلوم ہوا، تیرے سجدہ نہ کرنے سے پہلے یا سجدہ نہ کرنے کے بعد؟ اس پر ابلیس نے جواب دیا کہ مجھے انکار کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سجدہ کرنا میری تقدیر ہی میں نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ سجدے کا حکم دیے جانے کے بعد سجدہ کرنے اور نہ کرنے کے معاملے میں وہ آزاد تھا، اس نے تکبر کو اختیار کر کے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا، اور بعد میں کہتا ہے کہ یہ اُس کی تقدیر ہی میں نہیں تھا۔ گویا وہ اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دے رہا ہے۔

عمل کی آزادی ہر انسان کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسان اپنی آزادی کو حکم الٰہی کے تحت کر سکتا ہے یا نہیں؟ آدمی آزاد ہے۔ چاہے عمل کرے یا نہ کرے۔ عمل کے اعتبار سے جزا مرتب ہوتی ہے۔ تقدیر والی بات تو عمل سے پہلے نہیں ہے بلکہ عمل کے بعد والا معاملہ ہے۔ عمل کے نیک یا بد ہونے کا علم تو پہلے ہی سے ہوتا ہے۔ باوجود علم کے اگر وہ اس علم کے خلاف کرے تو اس میں تقدیر کا کیا دخل؟ رہ گئی تدبیر، تو تدبیر کا کارآمد اور ثمرآور ہونا یا نہ ہونا یہ بھی عمل آوری کے بعد ہی کا نتیجہ ہے۔ کسی عمل سے پہلے علم ہے، تجربہ ہے، مشورہ ہے اور پھر تدبیر ہے، اس کے بعد ارتکاب ہے، پھر نتیجہ ہے، مسلمان مذکورہ قرآنی آیت سے سبق لیں۔

نفس امارہ اور اس کا تزکیہ: (سورۃ الکہف۔۲۸)

﴿وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَ لَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ، تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَ لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا﴾

(اور اپنے دل کو ان لوگوں کی سنگت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح شام اس کو پکارتے ہیں۔ اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند

کرتے ہو اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہنا نہ ماننا۔)

آیت مذکورہ کے شان نزول میں چند واقعات مذکور ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سب ہی اس آیت کے نزول کا سبب بنے ہوں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق سرداران قریش جو مشرک تھے وہ حضور ﷺ سے کہتے تھے کہ یہ بلال، صہیب اور عمار بن یاسر اور خباب بن ارت اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین جیسے غریب لوگ جو تمہاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں ہم ان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کو ہٹاؤ تو ہم تمہاری مجلس میں آسکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔

دوسری روایت بغوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے کہ عیینہ بن حصن فزاری جو مکہ کا سردار تھا وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ کے پاس حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے، جو فقراء صحابہ میں سے تھے۔ ان کا لباس خستہ اور ہیئت فقیرانہ تھی، اسی طرح کے کچھ فقراء اور غرباء مجمع میں تھے۔ عیینہ نے کہا کہ ہمیں آپ کے پاس آنے اور آپ کی بات سننے میں یہی لوگ مانع ہیں۔ ایسے خستہ حال لوگوں کے پاس ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ آپ یا تو ان کو اپنی مجلس سے ہٹا دیں یا پھر کم از کم ہمارے لیے علیحدہ مجلس بنا دیں۔ چنانچہ اس طرح کے واقعات پر ارشاد باری ہوا، جس میں ان لوگوں کا مشورہ قبول کرنے میں سختی کے ساتھ منع کیا گیا، بلکہ اس کے برعکس یہ حکم دیا گیا کہ آپ اپنے نفس کو ان کے ساتھ باندھے رکھیں، مطلب یہ ہے کہ تعلقات اور توجہات سب ان لوگوں کے ساتھ وابستہ رکھیں، معاملات میں انہی سے مشورہ کریں، انہی کی امداد اور اعانت کیا کریں، اس کی وجہ اور اس کی حکمت یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ لوگ صبح و شام، یعنی ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں، اسی کا ذکر

کرتے ہیں، ان کا عمل خالص اللہ کی رضا کے لیے ہے اور یہی باتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مدد کو کھینچتی ہیں، اللہ کی مدد ایسے لوگوں کے لیے آیا کرتی ہے۔

چند روز کی کسمپرسی سے نہ گھبرائیں۔ انجام کار فتح و نصرت ان ہی کو حاصل ہوگی۔

ابھی یہ سوال کہ ان کا مشورہ تو قابل عمل تھا کہ ان کی ایک مجلس الگ کر دی جاتی تاکہ دعوت الی الاسلام کے پہنچانے میں سہولت ہوتی۔ مگر اس طرح کی تقسیم میں سرکش مالداروں کا ایک خاص اعزاز واکرام تھا، جس سے غریب مسلمان کی دل شکنی یا حوصلہ شکنی ہوسکتی تھی، یا پھر ان کی غربت کا احساس ان کو دلایا جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو گوارا نہ فرمایا اور اصول تبلیغ دین یہی قرار دیا کہ مساوات قائم رہے۔ یہ وہ صحابہ کرام ہیں جو حضور ﷺ کی صحبت میں رہ کر نفس امارہ کو مغلوب کیا تھا اور بعض حضرات تو اسی کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے قدموں میں آپڑے تھے۔ تاریخ اسلام میں ان کا لقب ''اصحاب صفہ'' ہے۔

جب تک نفس امارہ مغلوب نہ ہو، انسان شریعت اسلامیہ کی مکمل اطاعت نہیں کر سکتا۔ ارکان ظاہری یعنی: نماز، روزہ، زکوۃ، حج کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت ہوگی، تو نفس امارہ مغلوب ہوگا۔ صحابہ کرام معیت رسول ﷺ سے نفس امارہ کے خلاف جہاد کرنے کے لیے روحانی طاقت حاصل کرتے تھے۔ پھر اس طاقت اور حوصلہ اور ولولے کے حصول کے بعد اپنے نفس کو مغلوب کرتے تھے۔

''نفس امارہ'' کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

﴿عَدُوُّکَ فِی جَنْبِکَ﴾

(تیرا دشمن تیرے پہلو میں پوشیدہ ہے۔)

ان دشمنوں کے نام یہ ہیں:

(۱) خواہشات۔ (۲) غصہ۔ (۳) حب جاہ و مال۔ (۴) حرص وطمع۔ (۵) تکبر

مذکورہ آیت (سورۃ الکہف۔آیت۔۲۸) میں جہاد اکبر کے لیے صحبت ضروری بتلائی گئی ہے۔کیونکہ انسان اپنی اصلاح آپ نہیں کرسکتا،اپنی خرابیوں کوخودنہیں دیکھ سکتا،اس کے برعکس انسان اپنے نفس کے بارے میں خوش گمانی رکھتا ہے۔حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ نفس کا علاج کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:اس کی مخالفت کرنا۔مخالفت تو اس وقت ہوگی جب کہ آدمی اپنے نفس کو برا سمجھے،اس سے بدگمان رہے،خود بینی اسی کا نام ہے کہ آدمی اپنے عمل،اپنی سوچ اور اپنی فکر ہی کو بہتر سمجھتا رہے۔اس طرح خود بینی دراصل خودفریبی ہے اورخوش فہمی ہے۔اوراس کا علاج ''صحبت صالح''ہی سے ہوسکتا ہے۔منصب نبوت میں تزکیہ نفس ہے کہ رسول اللہ ﷺ امت کا تزکیہ نفس کیا کریں۔نفس کے سلسلے میں قرآن میں کئی مقامات پر ہدایت کی گئی ہے۔سورۃ التوبہ:۱۶۔سورہ العنکبوت :۶۔سورۃ البقرہ:۲۱۸۔سورۃ آل عمران:۱۴۲۔سورۃ انفال:۷۵-۷۴۔سورۃ التوبۃ:۲۰،۸۰۔سورۃ العنکبوت:۶۹۔سورۃ التوبہ:۷۳۔سورۃ التحریم:۹۔سورۃ الفرقان:۵۲۔سورۃ الحج:۷۸۔وغیرہ۔

ماہیت نفس سے معرفت نفس حاصل ہوتی ہے،عناصر اربعہ آگ، پانی، ہوا،مٹی سے موالید ثلاثہ یعنی جمادات،نباتات،حیوانات اورانسان کی پیدائش ہوئی۔ان عناصر کے جواہر مختلف ہیں ان میں جس قدر لطافت ہوگی اسی قدر وہ قوی ہوتے ہیں، اللہ کی ذات لطافتوں کا منبع ہے لطافت کی انتہا ہونے سے ہی وہ آنکھوں سے اوجھل ہے۔ ہر لطیف چیز کو بقدر لطافت حق تعالیٰ سے مناسبت ہے،اور جس قدر اللہ کی ذات سے قرب وصفی انسان کو ہوتا جاتا ہے،اسی قدر اس میں لطافت پیدا ہوکر قوت غلبہ اور اقتدار کی صفت آتی جاتی ہے۔ایسی

صفت ہی کو شانِ اختیاری کہتے ہیں۔ نفس کی اصلاح بغیر نفس کی معرفت کے ناممکن ہے۔ یعنی انسان یہ جان لے کہ نفس کے اندر کیا صفات ہیں؟ اور کون کون سی قوتیں ہیں؟ اور کن کن قوتوں کے درمیان کشمکش ہے؟ اس طرح انسان اپنے نفس کی کمزوریوں کو جان لے۔ پھر ان کو دور کرنے کے لیے مجاہدہ نفس کرے۔

انسان کی پیدائش عناصر اربعہ سے ہے۔ اور نفس امارہ میں قوت اور زور اور اس میں نمو غذا سے ہے۔ گویا عناصر اربعہ کے خواص میں طاقت اور اس میں ترقی کا ذریعہ غذا ہے۔ اور یہی غذا ابقاء وجود کا ذریعہ ہے۔ جن عناصر سے نفس بنا ہے ان عناصر کے خواص بھی نفس میں موجود ہیں۔ یعنی انسانی نفس میں حرص و ہوس، غصہ، کبر، حسد، شہوات، خواہشات، بخل، خودسری، خودغرضی، خود بینی، خودفریبی، خوش فہمی، خودمستی، وغیرہ موجود ہیں۔ ان مذکورہ خواص اور صفات کی وجہ سے انسان میں پستی اور محتاجگی آجاتی ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے صرف ربانی اخلاق کا حصول ضروری ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نفس روحانیت کی پناہ میں آجائے، جو اپنے اندر ربانی صفات کا جز لی ہوئی ہے۔ اس کی پناہ سے ''نفس امارہ'' پہلے ''نفس لوامہ'' میں پہنچ جائے گا، پھر ایک وقت آئے گا کہ وہ ''نفس مطمئنہ'' کے مرحلے میں داخل ہو جائے گا۔ اس کے لیے انسان کو بہت ہی سخت مراحل سے ایک مدت تک گزرنا پڑتا ہے۔

فکر کے مراحل سے ذات کے نکھرنے تک
عمر بیت جاتی ہے زندگی سنورنے تک

ربانی اخلاق یا روحانی اخلاق کیا ہیں؟

ایثار، سخاوت، قناعت، تواضع، ضبطِ نفس، صبر و شکر، وسعت، حوصلہ، استغناء، وقار،

خودداری، بے نیازی، بے احتیاطی، استغناءِ جاہی، اور استغناءِ مالی وغیرہ۔

ان سارے اخلاق کے ظہور کے لیے اعمال ضروری ہیں۔ اعمال کی کیفیت اور کمیت کے تعیّن کے لیے نہ صرف شرع، بلکہ نمونہ من اللہ بصورت رسول اکرم ﷺ موجود ہے۔(۱) انسانی جسم اعمال کے صدور کے لیے ذریعہ بنے، (۲) عقل قانون زندگی کی رہبری میں مددگار ہو جائے۔ اس طرح جسمِ انسانی اور عقلِ انسانی، قانون انسانی پر چل کر روح کو نفس مطمئنہ کے درجے میں رکھے۔ پوری شریعت احکام، بشمول ارکان اسلام: جہاد، حصول علم دین وغیرہ کا منشاء یہ ہے کہ مومن تزکیہ نفس کے ذریعے اللہ کی رضا کو حاصل کر کے خود کو آخرت کے اعتبار سے قیمتی بنا لے۔
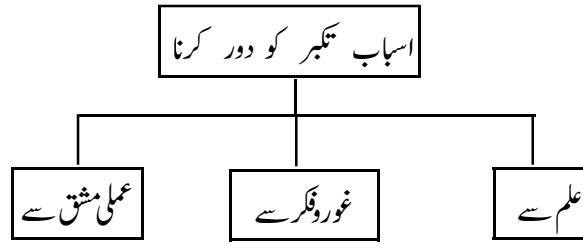
تزکیہ نفس کے تفصیلات اور لوازم کو سمجھنے کیلئے کچھ خاکے منسلک ہیں
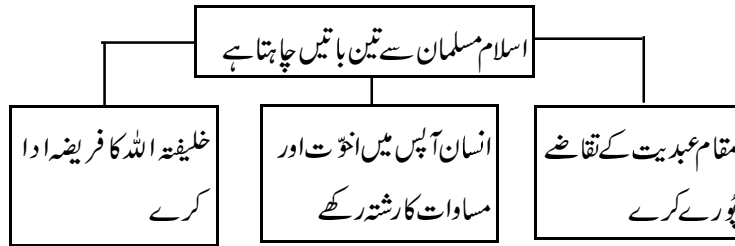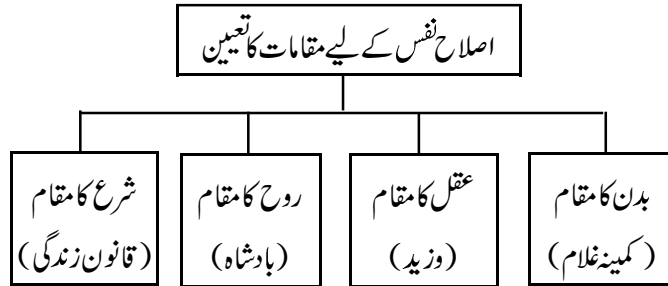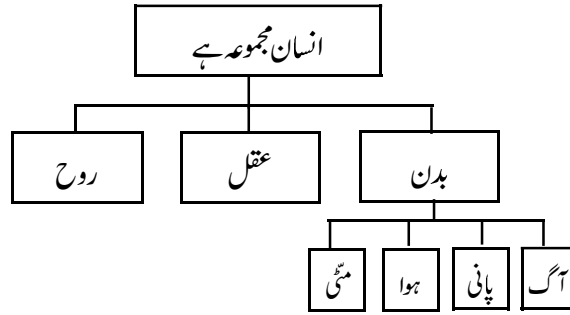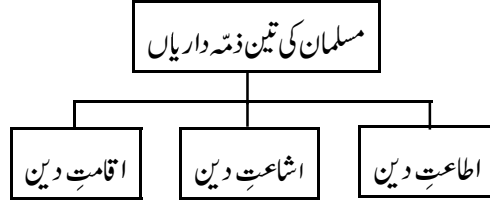
(۱) روح اور بدن کے مجموعہ کا نام انسان ہے

(۲) نفسی محرّکات کا اِمالہ مقصود ہے نہ اِزالہ مقصود ہے

Note: Educating the mind with out educating

the heart is no education at all.
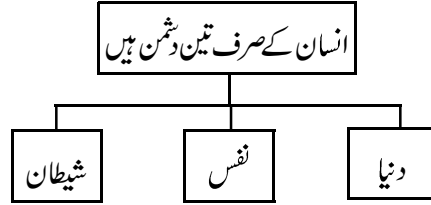
(۱) نفس سے پرہیز اس طرح کریں کہ نفس کی مخالفت، ترک شہوات اور خواہشات کے اعتبار سے کریں۔

(۲) شیطان سے پرہیز شیطان سے دوری، شریعت الٰہی پر پابندی سے ہوسکتی ہے۔

(۳) دنیا سے پرہیز اس طرح کہ جو چیزیں صرف زندگی میں کام آنے والی ہیں اور قبر میں کام آنے والی نہیں ہیں، ان سے بقدر ضرورت، بقدر حاجت، مستفید ہوں اور ان کی محبت میں نہ پڑیں، چنانچہ قبر میں کام نہ آنے والی چیزیں:
کھانا، پانی، لباس، مکان، نکاح وغیرہ وغیرہ۔
حدیث: **الفقر فخری.** (تنگدستی یا غریبی میرے لیے باعث فخر ہے)۔

شرائع اور احکام

حقیقت میں تزکیہ کے جُزئیات ہیں جو تزکیہ کو کامل کرتی ہیں، اور تزکیہ کو روشن کرتی ہیں۔ قرآن فہمی اور قرآن دانی سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، اسی سے اعمال میں وسعت اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔ علم، عمل ہی سے پختہ ہوتا ہے۔

پس اسلامی قوانین کا اصل مقصد (۱) تزکیہ اور (۲) تقوی کو بڑھانا ہے۔ جیسے:
نماز: بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے۔
زکوۃ: اپنے مال کی پاکیزگی کے لیے دی جاتی ہے۔

روزے: سے مقصد، تقوی اور پرہیزگاری ہے۔

حج: میں بہت سے مقاصد ہیں۔

اگر اسلامی قوانین ان مقاصد سے محروم ہوجاتے ہیں تو تزکیہ اور تقوی دونوں بھی حاصل نہیں ہوسکتے۔ اسلامی احکام اور قوانین کو اللہ کے صفات اور آخرت کے عقیدے کے درمیان رکھ کر بیان کیا گیا ہے، تاکہ قاری احکام سے متاثر ہوکر عمل پیرا ہوجائے۔

مذکورہ اسباب مختلفہ کی وجہ سے انسانوں کے درمیان ہر اعتبار سے فرق ہوگیا ہے۔ کوئی اچھے مواقع اور اچھے ذرائع پاتا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ صلاحیتیں بھی اچھی ہوتی ہیں، تو ایسا شخص دنیا میں تعلیم یافتہ ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اس کی جسمانی طاقت، صحت اور دیگر خوبیاں بھی اس میں ہوتی ہیں جن کی بناپر زندگی خوشحال ہوجاتی ہے۔ اپنے اخلاق اور عادات کو سنوارتا ہے، معاشرے میں شہرت ہوجاتی ہے، اس طرح تعلیم وتربیت، اخلاق اور حسن معاشرت میں سب سے آگے نکل جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے کم وقت اور کم محنت سے زیادہ دولت کما سکتا ہے۔ اس کے برخلاف کوئی ایسا ہوتا ہے کہ اس کو مواقع بروقت اور موزوں نہیں مل سکتے، ذرائع محدود ہوتے ہیں، حالات ناسازگار، صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی کمی ہوتی ہے، ایسی صورت میں ایسا آدمی سخت محنت کے باوجود زیادہ دولت نہیں کما سکتا۔ بہرحال مذکورہ اسباب کی بناپر دنیا کے سارے انسانوں کے درمیان دولت کے اعتبار سے، تعلیم کے اعتبار سے، جاہ واقتدار کے اعتبار سے، رہن وسہن کے اعتبار سے، معاشرے میں رتبے کے اعتبار سے، دینی علم وعمل کے اعتبار سے، عادات واطوار کے اعتبار سے، حسب ونسب کے اعتبار سے، اور دیگر متفرقہ اعتبارات کے پیش نظر فرق ہوجاتا ہے۔ یہ سنت اللہ ہے۔ نتیجتاً کوئی دولت مند، کوئی مخلص، کوئی خوشحال، کوئی بدحال، کوئی کثیر العیال، تو کوئی لاولد، تو کوئی کم

اولا دوالا، کوئی اولا دنر ینہ سے محروم، تو کوئی اور طرح سے محروم، کوئی عالم، تو کوئی جاہل، کوئی حاکم، تو کوئی محکوم، کوئی آ قا، کوئی خادم، کوئی ذہین، کوئی غبی، کوئی نادان، کوئی عقلمند، کوئی قد آور، تو کوئی کشیدہ قامت، کوئی خوبصورت، تو کوئی قوی، کوئی زمیندار، تو کوئی کاشتکار، کوئی چودھری، تو کوئی سردار، کوئی فقیر، تو کوئی مسکین، کوئی صحت مند، تو کوئی بیمار وغیرہ وغیرہ۔

انہی اختلافات سے دنیا بھری ہوئی، دنیا سجی ہوئی ہے۔ نتیجتاً دولت مند میں تکبر، فخر وغرور، فقیر میں مسکینیت، عاجزی، خاکساری، اور کم دولت مند میں حسد، ہوس کا جذبہ۔ اس طرح ساری روحانی بیماریاں جیسے: ظلم وزیادتی، فتنہ، فساد، لوٹ، کھسوٹ، ناانصافی، دھوکہ، فریب سے دنیا بھری ہوئی ہے۔ یہ خرابیاں ہر شہر میں، ہر ملک میں، ہر بستی میں، ہر خاندان میں، مشرق میں، مغرب میں، شمال میں، جنوب میں، ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ہر ایک کا دل حرص وہوس، رشک وحسد، فخر وغرور سے بھرا ہوا ہے۔ اور ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ اس کو دوسرے سے زیادہ مل جائے۔ لیکن سنت اللہ یعنی (قدرت کا قانون) یہ ہے کہ سب کو کچھ کچھ ملتا ہے، ہر ایک کو سب کچھ یا سب کو سب کچھ نہیں ملتا، پھر کسی کو جلدی اور کسی کو دیر سے ملتا ہے۔

ایسی دنیا میں صبر ضروری ہے:

دنیا کی چاہت تو سب کے دل میں ہے، لیکن حصول دنیا میں کمی اور زیادتی سب من اللہ ہے۔ اور یہ حکومت الٰہی کا تقاضہ ہے، الٰہی قانون ہے۔ اور اسی کا نام تقدیر ہے۔ جس کو دنیا مل گئی تو وہ تکبر کی نفسیات میں جینے لگا اور جس کو کم ملا وہ حسد کے نفسیات میں پڑ گیا۔ اس طرح تقدیر پر راضی تو دونوں بھی نہ ہو سکے۔ دولت مند کے لیے ایک امتحانی پرچہ ہے کہ فخر وغرور میں پڑ جاتا ہے یا نہیں؟ جس کو کم ملا اس کا امتحانی پرچہ یہ ہے کہ حسد کی آگ میں جلتا ہے

یا نہیں؟ فروق کا سارا نظام عالم انسان کی آزمائش کے لیے ہے۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

اسی طرح گناہوں کی جڑ دنیا ہوئی، دنیا کی محبت ہوئی، دنیا داری ہوئی، دنیا رخی زندگی ہوئی، یا نہیں؟

ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک ''انا'' موجود ہے۔ عام حالت میں یہ جذبہ سویا رہتا ہے۔ اس کے شر سے محفوظ رہنا ہے تو اس کو خوابیدہ ہی رہنے دیں، اس کو بیدار کرے تو فساد ہوگا۔ عملاً اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی نادان یا کسی کم دین یا کسی فسادی آدمی کی طرف سے دوسرے انسان کو تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح ''انا'' کی بیداری عمل میں آتی ہے۔ اکثر حالات میں اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ابتدائی تکلیف کو برداشت کرلیں۔ یعنی اس کا جواب دینے کی کوشش نہ کریں۔ یہ گویا ایسا ہی ہے جیسے کنکری کی چوٹ برداشت کر لینا ہے۔ اسی کو Tolerance کہتے ہیں۔ اس کے لیے بھی صبر کی ضرورت ہے، برداشت خود صبر ہے اور ایمان کا دوسرا نام صبر ہے۔ اگر اعراض نہ ہوسکا تو، برداشت اس کا عملی واحد حل ہے۔ دکھ بھری دنیا میں سب کے ساتھ رہنا ہے، قرآن مجید میں صبر کا ذکر ہے، دنیا امتحان گاہ ہے، عیش گاہ نہیں ہے۔

حدیث: ''**الدُّنْيَا سِجْن الْمُؤْمِنِيْنَ وَ جَنَّةُ الكَافِرِيْنَ.**'' مؤمن امتحان گاہ کو خواہشات کی تکمیل کا مقام سمجھے تو مایوسی ہوگی۔ مومن اگر اس دنیا کو امتحانی میدان سمجھے اور اللہ کے حکم اور رسول کے طریقے پر زندگی گزارے گا تو مایوسی کی نفسیات سے دوچار نہیں ہوگا۔ اس طرح امتحانی مزاج والا یعنی خالق رخی زندگی گزارنے والے کی سوچ اور اس کا عمل انسان کی

روح کے لیے روحانی غذا کا کام کرتا ہے۔ جس طرح مادی وجود کے لیے مادی غذا ضروری ہے، پھر اسی روحانی غذا کی کثرت سے ربانی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایسوں ہی کے لیے کامیابی ہے، جنت ہے۔
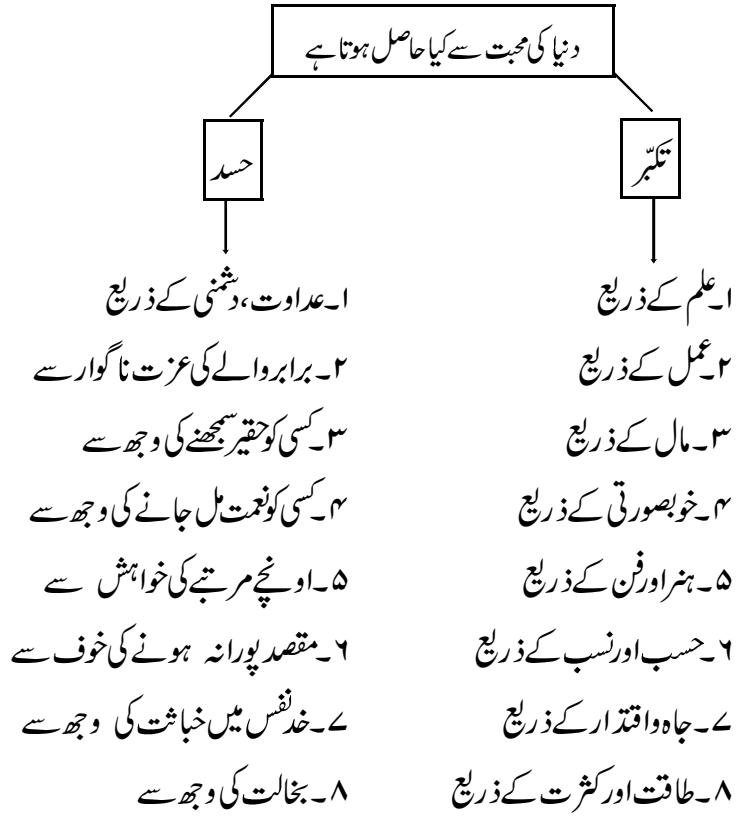
احادیث:

(ا) عنقریب میری امت میں دوسری امتوں کا مرض پھیلے گا۔ یعنی: شر، تکبر، کثرت جتانا، دنیا میں حاصاً حرصی کرنا، اور ایک دوسرے سے دوری چاہنا، آپس میں حسد

کرنا، یہاں تک کہ فتنہ ہوگا۔

(۲) مجھے زیادہ تر خوف اس بات کا ہے کہ میری امت میں لوگوں کے پاس مال کثرت سے آئے اور پھر آپس میں حسد کی وجہ سے قتل وخون ہو۔

(۳) تین باتیں ایسی ہیں جن سے کوئی خالی نہیں۔ظن (بدگمانی)، بدشگونی، حسد۔مگر میں تم کو ان سے نجات کی صورت بتلاتا ہوں، کہ جب کوئی ''بدگمانی'' دل میں گزرے تو اس کو غلط جانو اور جب ''شگون'' پیدا ہو تو اس کی طرف دھیان مت دو اور اپنا کام کیے جاؤ اور جب ''حسد'' دل میں آجائے تو اس کی خواہش نہ کرو۔یعنی اپنے ذہن میں مسلسل اس کو جگہ نہ دو۔

(۴) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اللہ کی نعمتوں کے دشمن ہیں، لوگوں نے عرض کیا کون؟

آپ نے فرمایا: جو کوئی نعمت لوگوں پر دیکھ کر حسد کرتے ہیں۔

(۵) لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةٌ، وَ فِتْنَةُ أُمَّتِيْ الْمَالُ

ہر امت کا ایک فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔